Urdu Research Journal: Refereed Journal for Urdu,ISSN 2348-3687,Issue: 11th July-Sept. 2017 Page No. 104-110

فکشن تنقید

حسین بن منصور حلاج اور سدھارتھ میں فکری مماثلت: تحقیقی و تنقیدی جائزہ

محمد فرید

لیکچرار شعبۂ اُردو، اوپی ایف بوائز کالج ایچ ایٹ فور، اسلام آباد، پاکستان

Abstract:

The Critical Analysis regarding Comparison of Intellectual Leitmotifs of Hussain Bin Mansoor Hillaj and Siddhartha , Novel Dasht-E-Soos is comprised of Hussain's life while novel Siddhartha discusses the life of Gotham. Both the novels are about the matchless personalities of history mysticism/spiritualism of God, existentialism human beings, the relation between society and universe, spiritual and mental anxiety and the quest of truth under the owthemticity of metaphysical experiences are the subjects of both novels. This research article critically analysis regarding compersion of intellectual lietmotifs of Hussain Bin Mansoor Hillaj and Siddhartha, the heros of these novels .

دشتِ سُوس اور سدھارتھ کے مرکزی کرداروں حسین بن منصور حلاج اور سدھارتھ میں موافقت کا تنقیدی مطالعہ مندرجہ ذیل ہے:-

ا۔ جذبے کی صداقت:

"دشتِ سُوس" کا حسین بن منصور حلاج اپنے جذبے کی صداقت میں کوئی ثانی نہیں رکھتا۔ وہ اگر چاہتا تو دربار سے جڑا رہ کر ہر طرح کے فوائد حاصل کر سکتا تھا لیکن اس نے خلیفہ کا قرب حاصل ہونے کے باوجود دربار کی آسائشات سے بھری زندگی کو چھوڑ کر صوفیا کرام کی خانقاہوں اور مدارس کا انتخاب کر کے مجاہدات اور نفس کشی کی ریاضتوں سے پُر ایک مشکل زندگی کا انتخاب کیا۔ حسین راہ حق کا وہ مسافر ہے کہ جو اپنی منزل کے حصول کے لیے دنیا و مافی ھا سے بے خبر ہو کر جد و جہد جاری رکھتا ہے۔ اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

"حسین بن منصور کا معاملہ سب سے الگ اور نرالا تھا۔ وہ عبادات میں بھی خشوع وخضوع اور غلو کے ساتھ مستغرق رہتا تھا اور اسدنیا و مافی ھا سے بے خبر اور بے نیاز ہو جاتا تھا اور دوسری طرف اس کا نعرہ انالحق اس کے جسم و جان کو الھتا بمیں جھونک دیتا تھا۔ یہ ہر لمحہ اس کی زبان پر جاری رہتا اور اس کی رگ رگ میں اور نس نس میں اترا ہوتا تھا۔ یہی اس کی محیر العقول روحانی قوت کا سرچشمہ تھا۔"(۱)

حسین حق کو خود پر ظاہر ہونے کی ہمہ وقت دعائیں کرتا رہتا۔ اس کی پیاس شدید تھی اور جذبے جوان اور خلوص سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ ایک ایسا سوالی تھا جس کے سوال میں شدید طلب اور حق کے لیے شدید محبت تھی۔

"وہ جبل رحمت پر بیٹھا رہتا اور سوالی ہوتا۔ اے نور حق! مجھ پر ظاہر ہو۔ اے نور حق مجھ پر ظاہر ہو۔ اے رب کعبہ مجھ پر منکشف ہو۔ جیسے ایک ذرۂ ناچیز آفتاب کو پکارے۔ اپنے آفتاب ہونے پر دلیل دے۔ حسین تم کہیں کے نہ رہے۔ ایں ہمہ رفت و آں ہم رفت۔"(۲)

سدھارتھ بھی حسین کی طرح جب راہ حق کا مسافر بنتا ہے تو ایک پر آسائش زندگی چھوڑ کر تکالیف و آلام کو گلے لگا لیتا ہے۔ وہ ایک برہمن زادہ ہوتے ہوئے زندگی کے ہر سکھ

کو بڑے قریب سے دیکھتا ہے۔ اس کے بعد اس کی زندگی مجاہدوں اور ریاضتوں کے طویل اور کٹھن مراحل سے گزرتی ہے:

"سدھارتھ تپسیا کرنے لگا۔ وہ سخت گرمی میں پیاس اور درد کو برداشت کرتا ہوا اس وقت تک چپ چاپ کھڑا رہا جب تک پیاس اور درد کا احساس ختم نہیں ہو گیا۔ وہ بارش میں بھیگتا رہا۔ اس کے بال پانی میں تر بہ تر ہو گئے اور ان میں سے بوندیں ٹپکنے لگیں۔ ٹھٹھرتے کندھوں، لرزتے کولہوں اور پیروں پر۔ پھر بھی وہ کندھوں اور پیروں کے انجماد تک کھڑا بھیگتا رہا۔ وہ کانٹوں کی سیج پر لیٹ گیا۔ جسم سے خون رسنے لگا۔ زخم ناسور ہو گئے، پھر بھی وہ کھڑا رہا جب تک کہ خون بہنا بند نہ ہو گیا۔ ٹیس ختم نہ ہو گئی۔"(۳)

۲۔ بغاوت:

"دشتِ سُوس" کا حسین بن منصور حلاج کسی مرشد اور ہادی کی ضرورت سے ماورا تھا۔ کئی امور میں وہ اپنے اساتذہ سے بھی آگے تھا، وہ معرفت اور راہ سلوک کے رازوں سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسے اسم اعظم جاننے کی بھی خواہش تھی۔ وہ اپنے اساتذہ کی غلطیاں پکڑ تا تھا۔ اسے روایتی درس، علم اور سوچ سے آزادی کی خواہش تھی۔ وہ آسان اور مخصوص نظریات کے گرد بسر ہونے والی زندگی کو ناپسند کرتا تھا۔ اس کی پیشانی پر جلنے کا داغ اس کی بغاوت کا نشان تھا۔ اس نے منع کرنے کے باوجود گنج نامہ چرایا کیونکہ وہ ہر حال میں اس کے رازوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا تھا:

"قربِ الٰہی کا خواہاں شخص روح کو شق کیے بنا قرب حاصل نہیں کر سکتا، مگر اس راستے میں دو ہزار آگ کے پہاڑ اور ایک ہزار ہلاکت خیز بحر بیکراں ہیں جو ان دونوں سے خائف ہوئے بغیر راستہ طے کرنا چاہے وہ اس میں قدم رکھے۔ زمین کے مخفی خزانے اور ان کے اسرار، ابلیس کے انکار سجدہ کا اسرار فرشتوں کے سجدہ کا اسرار، روح کے شق کا اسرار۔ قرب الٰہی کا اسرار۔ نفس کے شق کا اسرار۔ اسے یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ اسرار کیا ہیں مگر وہ کیا ہیں اس کی خبر اسے نہیں ہو سکی تھی۔ اس نے گنج نامہ کے سارے مطالب نقل کر لیے تھے۔"(۴)

ناول کا مرکزی کردار حسین مختلف مواقع پر بغاوت کے خیالات کا پرچار کرتا نظر آتا ہے:

"جب تم مجھے دیکھتے ہو تو گویا اسے دیکھتے ہو۔"(۵)

"تم میرا طواف کر لو۔ سات بار میرے گرد چکر لگا لو۔"(۶)

"ابلیس اور محمدؐ کے سوا اور کسی کا خاص مقام نہیں۔"(۷)

"یہ کیا لکھ رہے ہو؟ اقطع نے اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا؟ قرآن حکیم کا جواب حسین نے سر اٹھائے بنا جواب دیا۔"(۸)

حسین بن منصور حلاج اور سدھارتھ دونوں اپنے اساتذہ اور مذہبی رہنماؤں کی تعلیمات اور عقائد پر اندھا یقین کرنے کے بجائے اپنی ذات کی تلاش کے سفر پر نکلتے ہیں۔ دونوں اس دنیا میں رہتے ہوئے ہر مشکل کو برداشت کر کے آگے کی طرف سفر جاری رکھتے ہیں۔ دونوں سخت مذہبی انتشار کا شکار ہوتے ہیں اور اپنے علما کی تعلیم پر شک کا اظہار کرتے ہیں۔ دونوں خود اپنی کوشش سے اپنے مقصد تک پہنچنے یا اس کی تلاش میں فنا ہو جانے کے عزم کا اظہار کرتے ہیں۔

سدھارتھ گوتم بدھ کی تتھاگت کی تعلیم سے متاثر ہونے کے باوجود اس کے بعض پہلوؤں سے متفق نہ ہونے کے باعث مکمل اطاعت قبول نہیں کرتا اور اپنے لیے خود راستہ بنا کر بغاوت کرتا ہے:

"ایک شخص ملا صرف ایک شخص جس کے سامنے آنکھیں خود بخود جھک گئیں، سدھارتھ نے سوچا، اب کسی کے بھی آگے آنکھیں نہیں جھکاؤں گا۔ اب کسی کی نصیحتیں مجھے متاثر نہیں کر سکیں گی۔ جب اس آدمی کی نصیحتیں ایسا نہ کر سکیں۔"(۹)

۳۔ تحصیلِ علم کی پیاس:

"دشتِ سُوس" کا حسین علم کی پیاس رکھتا ہے جس کے لیے وہ دیارِ غیر کا سفر اختیار کرتا ہے۔ مختلف صعوبتیں برداشت کرتا ہے۔ حسین کا آبائی علاقے سے تستر، تستر سے بصرہ وہاں سے دوحرقہ، پھر بیضا، اس کے بعد بغداد، حجاز اور مختلف علاقوں کا سفر کرنا، سہل بن عبداللہ تستری، عمر بن عثمان مکی، ابویعقوب اقطع، حضرت جنید بغدادی، حضرت شبلی جیسی نابغہ روزگار ہستیوں سے فیض حاصل کرنا اس کی تحصیل علم کی پیاس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ علم کی آتشِ شوق حسین کو مدام حالت اضطراب میں رکھتی ہے لیکن یہ امر بہر حال قابل غور ہے کہ حسین جو ہمہ وقت حالت اضطراب و کشاکش میں الجھا رہتا ہے کہیں سے اپنے لیے تسکین کا کوئی پہلو نہیں پاتا تو وہ علم و آگاہی کی ان حدود سے باہر نکال کر وسیع تر فضاؤں میں پرواز کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ خالق حقیقی سے براہِ راست ربط و اتصال کا خواہاں ہے۔ حسین حقیقت مطلقہ کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ اس کی جب کہیں سے تسلی و تشفی نہیں ہوتی تو وہ ان سوالات کے جوابات حاصل کرنے کے لیے خود غور و فکر کرتا ہے۔ وہ ان اسرار و رموز کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے جو اس کے اور حق کے درمیان حائل ہیں۔ حسین کی تحصیل علم کی اس پیاس کو اس کے دشمن غلط رنگ دے کر اس کے خون کے پیاسے ہو کر اپنی پیاس بجھانے کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ حسین عمار سے ہونے والے مکالمے میں حامد بن عباس کے بارے میں بتاتا ہے:

"سجدے سے سر اٹھا کر حسین نے کہا: جو پیاس خون سے بجھ سکے گی اسے آب زمزم نہیں بجھا سکتا۔"(۱۰)

حسین مختلف مواقع پر علم سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ اس پر تنقید کے نشتر بھی برسائے گئے کہ وہ شعبدہ باز ہے اور لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے روحانیت کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ حسین تو راہ حق کا متلاشی تھا جس کی طلب وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی تھی:

"حسین نے اپنے جھومتے ہوئے سر کو سنبھالنے کی کوشش میں کہا: میں ذاتِ الٰہی میں فنا ہونا چاہتا ہوں۔ نظارگی میں میری ہوشیاری اور سرمستی حائل ہے۔" (۱۱)

"حسین کے اندر کے سپاہی نے اس کے جامے میں چھپے دربار دار نے سر اٹھایا۔ میں ریاکار نہیں راہ طلب حق کا مسافر ہوں۔" (۱۲)

سدھارتھ اور حسین بن منصور حلاج دونوں علم کی پیاسی شخصیات ہیں۔ علم کا مطلب ہے جاننا، دونوں عظیم ہستیاں اپنی ذات کی جان پہچان کے لیے راہ حق کی مسافر بنتی ہیں۔ روحانیت کی بنیاد علم اور عمل پر استوار ہے۔ شعور ذات اور شعور زماں صرف علم کے ذریعے ممکن ہے۔ علم ہی وہ واحد ہتھیار ہے کہ جس کو حاصل کر کے انسان آگہی حاصل کرتا ہے اور یہی شے اسے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔

سدھارتھ کے حصول علم کی خواہش اسے باپ کی نظروں میں بھی اہم مقام دلا رہی تھی:

"سدھارتھ کی صلاحیت اور حصول علم کی شدید خواہش دیکھ کر باپ مسرور ہوا۔" (۱۳)

۴۔ مشکل پسندی:

"دشتِ سُوس" کا حسین بن منصور حلاج مشکل پسند اور حالات کا مقابلہ کرنے والا ہے۔ وہ نتائج کی پرواہ کیے بغیر اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے والا ایک بہادر شخص ہے۔ گنج نامہ چرانے کے بعد وہ اس کی سزا بھی بھگتنے کے لیے تیار ہے۔ "اناالحق" کا نعرہ مستانہ لگانے پر مثلہ ہونے کا امتحان ہو یا حامد بن عباس کی ذاتی دشمنی کے نتیجے میں مصائب و آلام کا سامنا وہ ہر مشکل کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن جاتا ہے۔ حامد بن عباس حسین سے اغول کی محبت کے دکھ میں اپنے رقیب سے انتقام میں ہر حد پھلانگ جاتا ہے۔ ایسے میں حسین قوت اور طاقت رکھنے کے باوجود پابند سلاسل رہتا ہے:

"کیا تمہیں رہائی کی ضرورت نہیں۔ عمار نے پوچھا، میں جس کی قید میں ہوں وہ مجھے نہایت درجے عزیز ہے۔ اس کی ایک نگاہ کے لیے میں اس زندگی کو ہی نہیں ایسی سینکڑوں زندگیوں کو قربان کر سکتا ہوں۔ میری ہستی کیا شے ہے۔" (۱۴)

شغب کی فرار کی پیش کش کے جواب میں وہ شہادت کے مرتبے پر فائز ہونے کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ اپنی فطرت میں موجود مشکل پسندی کی بدولت مشکلات کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے:

"شغب نے کہا یا شیخ! میں نے آپ کے یہاں سے فرار کا منصوبہ بنایا ہے۔ اگر آپ صاد کریں تو آج ہی رات نکل جائیں۔ ام جعفر۔ شہادت کی رات برسوں میں صدیوں میں قرنوں میں ایک رات ہوتی ہے۔ کیا اسے ٹھکرا دیا جائے۔" (۱۵)

اسی طرح آقائے رازی کے فرار کے منصوبہ میں بھی وہ مثبت جواب نہیں دیتا حالانکہ اس وقت بھی جیل کی سلاخیں اپنی جگہ سے ہٹ جاتی ہیں:

"حسین نے سلاخوں کی طرف دیکھا جو راستے سے ہٹ گئیں۔ وہ دونوں پاس کھڑے تھے، میں جس کی قید میں ہوں وہ مجھے رہا کرے تو، اس نے کہا۔" (۱۶)

حسین اپنے "اناالحق" نعرے کی پاداش میں سنگ باری سہتا ہے، کوڑے برداشت کرتا ہے، پائوں کٹواتا ہے یہاں تک کہ اس کی ایک ایک نس کاٹنے کا حکم دیا جاتا ہے وہ ان تمام مظالم کا بڑی خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتا ہے کیونکہ مشکل پسندی اس کے خون کا حصہ ہے۔ حسین کی طرح سدھارتھ کی شخصیت میں بھی مشکل پسندی کا وصف تھا۔ وہ اپنی زندگی کی مشکلات کے بارے میں سوچتا ہے تو اس کے سامنے پوری تصویر آ جاتی ہے:

"میری زندگی بھی کتنی عجیب ہے۔ اس نے سوچا، عجیب راہوں میں بھٹکتا رہا۔ جب بچہ تھا تو دیوتائوں اور ریگیوں کے زیر اثر تھا۔ جوان ہوا تو عبادات میں، غور وفکر اور استغراق میں لگا رہا، برہم کی تلاش میں تھا۔ آتما میں موجود غیر فانی وجود کی عبادت کرتا تھا۔ جب جوان تھا تو آتما کی صفائی کی طرف بھی راغب ہوا۔ جنگلوں میں رہا۔ گرمی اور دوسری مشکلات برداشت کی۔ بھوک پر عبور حاصل کیا۔ اپنے وجود پر فتح حاصل کی۔" (۱۷)

۵۔ حقیقت پسندی:

"دشتِ سُوس" کے حسین بن منصور حلاج کی حقیقت پسندی بطور مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ ناول میں کئی مواقع پر اس کی عملی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ حسین اس حقیقت کو پا لیتا ہے کہ راہ سلوک کی منازل طے کرنے کے لیے دربار کی آسائشات کی قربانی دینا ہوگی۔ ایک صوفی کا حکمرانوں یا دربار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ عمر بن عثمان مکی سے ہونے والے مکالمے میں وہ خود کو دربار سے علیحدہ کرنے اور ان کے درس میں شمولیت کا فیصلہ کرتا ہے:

"میں دربار کو چھوڑ دوں گا۔ آپ مجھے اپنے سائے میں رہنے کی اجازت دیں۔ اس کی عاجزی دیدنی تھی۔ اس کا سارا وجود پانی بن کر خاک بن کر، ہوا بن کر ان کے قدموں میں تھا۔" (۱۸)

حسین اپنے آپ کو روئی دھننے کے کام سے بھی علیحدہ کر لیتا ہے۔ دنیا کی طلب چھوڑ کر وہ تصوف کے راستے پر چل پڑتا ہے حالانکہ اس کے روئی دھننے میں غیبی مدد بھی شامل ہوتی تھی:

"اس کے روئی دھننے کی رفتار عام لوگوں سے بہت زیادہ تھی۔

لوگ کہتے وہ خود دبیٹھا رہتا ہے سب کام دست غیب سے

ہوتا ہے۔" (۱۹)

حسین اپنے مخالفین کو معاف کر دیتا ہے جو لوگ اس کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں اور جو اس پر سنگ باری کرتے ہیں وہ ان سے کوئی عداوت نہیں رکھتا ہے اسے اس بات کا ادراک ہے کہ راہ تصوف میں وہ جس منزل پر پہنچ چکا ہے اور اللہ تعالیٰ نے غیب کے جو پردے اس کے سامنے چاک کر دیے ہیں دوسرے ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ خاص لطف و کرم اس کی ذات پر ہے۔ حق کی جو تفہیم اسے ہوئی ہے وہ شاید دوسروں کا مقدر نہیں ہو سکتا اس لیے وہ اپنے مخالفن کو بے قصور قرار دیتا ہے کیونکہ انھیں اس کی حقیقت اور بلند مقام کا اندازہ نہیں ہے۔ اسے تو شبلی کے پھول مارنے پر زیادہ تکلیف ہوتی ہے کہ ان کا رویہ دوسرے صوفیہ و اکابرین سے مختلف ہے۔ اس کے نزدیک شبلی کا سنگ کی بجائے پھول مارنا حقیقت کے برعکس ہے۔ شبلی کو خلق خدا کے ساتھ بالخصوص اپنے ساتھی مشائخ کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے تھا کیونکہ یہی اس کا مقدر تھا اور مقدر کے لکھے کو کوئی ٹال نہیں سکتا:

"کیا یہ سنگ باری کفر کے خلاف نہیں ہے کہ تم لوگ اس میں حصہ نہیں لیتے۔ قاضی نے سنگ ریزہ شبلی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ یا شیخ یہ کفر کے خلاف ہے۔ کلمہ انا الحق اور اس کا کہنے والا سارے فقہا کے فتویٰ سے قابل گردن زنی قرار پایا ہے۔ آپ بھی دیوانے پر پتھر پھینکیں۔ شبلی نے پھول اٹھایا۔ اس کو اپنے ہاتھ میں تولا۔ نہایت آہستہ سے بازو لہرایا اور حسین بن منصور حلاج کی طرف اس کی پرواز کو دیکھتے رہے۔" (۲۰)

حسین ان افراد کو کہ جو اس کے روحانیت میں مقام بلند کی حقیقت سے ناآشنا رہتے ہیں کو موردالزام ٹھہرانے کی بجائے ان کے نہ جاننے کی اصلیت سے آگاہ ہو کر کوئی بھی غلط امید وابستہ کرنے کی بجائے حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے نہ صرف انھیں معاف کر دیتا ہے بلکہ جو ظلم و ستم وہ حسین پر روا رکھتے ہیں انھیں ہنسی خوشی جھیلتا ہے کیونکہ وہ اس معاملے میں بھی حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے جانتا ہے کہ نعرہ "انا الحق" کی حقیقت سے ناآشنا لوگوں کی طرف سے کس قدر شدید اور جان لیوا رد عمل آ سکتا ہے۔ "دشتِ سُوس" کا حسین اور "سدھارتھ" کا سدھارتھ دونوں حقیقت پسند ہیں۔ وہ دونوں لوگوں اور حالات سے زیادہ امیدیں وابستہ نہیں کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ جو لوگ انھیں نہیں سمجھتے وہ انھیں موردالزام نہیں ٹھہراتے۔

سدھارتھ مایا کے جال میں پھنس گیا اور دنیاوی لذتوں میں پڑ کر عیاشی، کاہلی اور قابل نفرت عادات میں گرفتار ہو گیا۔ اس نے دولت کمائی اور گنوائی اور یوں اس کے دل سے غریبوں کی امداد کی خواہش بھی جاتی رہی، قرض داروں کے تاخیر کرنے پر وہ جھلا اٹھتا اور اسے ذرہ برابر ندامت نہ ہوتی تھی، دولت بڑھانے کے لیے وہ جواری بن گیا تھا۔ وہ طوائف کی زلفوں کا اسیر ہو کر اس کے جسم سے کھیلتا رہا، جس کے نتیجے میں وہ ناجائز بیٹے کا باپ بن گیا۔ وہ زندگی کے بھنور میں مکمل پھنس چکا تھا۔ ایک اسپنج کی طرح وہ دنیا کی غلاظت کو اس وقت تک جذب کرتا گیا جب تک کہ وہ پوری طرح بھیگ نہ گیا۔ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود بھی وہ فطرت کی طرف لوٹ آتا ہے کیونکہ وہ زندگی کی حقیقت کو سمجھ جاتا ہے کہ یہ خواہشات، یہ عیش و عشرت اسے مسرت اور تسلی نہیں دے سکتی اور یہ کہ یہ زندگی فانی اور ناقابل اعتبار شے ہے یہی بات وہ اپنے دوست گووندا سے بھی کہتا ہے:

"یاد رکھو گووندا دکھائی دینے والی دنیا فانی ہے۔ ہمارے کپڑے اور بالوں کی تراش بھی فانی ہے، ہمارے جسم بھی فانی ہیں۔" (۲۱)

۶۔ نظریات و خیالات کی اثر پذیری کے حوالے سے:

حسین بن منصور حلاج اپنے مراقبات، گوشہ نشینی، عبادات میں خشوع و خضوع، نفس کشی اور مجاہدات کی بدولت لوگوں میں مقبول ہو گیا تھا۔ وہ قابل احترام گردانا جاتا تھا۔ دوسروں کی حاجت روائی کے سلسلے میں مستعدی اور خلوص کی وجہ سے ایک زمانہ اس کے نظریات و خیالات کا معتقد تھا۔ جہاں حسین کے دشمن اور مخالفین موجود تھے وہاں اس کی ایک آواز پر اپنی جان نثار کر دینے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ اس کے رسائل اور خطوط لوگوں نے اپنے گھروں میں محفوظ کیے ہوئے تھے۔

"بڑھیا کے پاس تھیلے میں چند خطوط تھے جو اسے ترکستان سے ابن منصور نے لکھے تھے"۔ (۲۲)

سہل بن عبد اللہ تستری، حضرت عمر بن عثمان مکی، جنید بغدادی، شبلی کا آپ کے تصوف میں بلند مقام کا اقرار، ابو عمر کا اپنے فیصلے پر نظر ثانی کا فیصلہ، شغب اور سیاوش کارہائی میں کردار ادا کرنے کا فیصلہ، حبشی اور پتھروں کا بھی "انا الحق" پکار اٹھنا، سزا پر لوگوں کی متضاد آرا، مثلہ اور دار کی سزاؤں کے باوجود حامد بن عباس کو قرار نہ ملنا اور سب

سے بڑھ کر محمی کے پوتے حسین کا خود آتشکدہ بن کر انا الحق انا الحق پکارنا اور ہجوم کا برابر ساتھ دینا اس کے نظریات کی دلوں پر حکمرانی کا منہ بولتا ثبوت ہے:

"کٹے ہوئے سر بریدہ لاشے کو، ان مثلہ کئے ہوئے بازوئوں اور پائوں کو اس ڈھیر پر آگ لگادی۔ ہجوم برابر نعرے لگا رہا تھا اور واویلا کر رہا تھا اور ہوا میں شعلے اور چنگاریاں اور ذرے انا الحق پکار رہے تھے۔"(۲۳)

"دشتِ سُوس" کا حسین اور "سدھارتھ" کا سدھارتھ دونوں اپنے اپنے نظریات وخیالات میں مخلص تھے۔ انھوں نے زندگی کی حقیقت کا راز بڑی ریاضت، محنت، مجاہدوں اور تپسیا کے بعد حاصل کیا تھا اس لیے ان کے الفاظ دوسروں پر اثر کرتے تھے۔ دونوں کے نظریات کی اثر پذیری دونوں ناولوں کا خاصہ ہے جہاں دشتِ سُوس کے حسین کے چاہنے والے نظر آتے ہیں تو وہاں سدھارتھ کے فلسفے کی سچائی گوونداکے سدھارتھ کے بارے میں خیالات سے لگائی جاسکتی ہے:

"... میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے سکون حاصل کر لیا ہے۔ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ میں اسے نہیں حاصل کر سکا۔ مجھے ایک بات اور بتائو میرے محترم دوست ایسی کوئی بات بتائو جس پر غور وفکر کر سکوں۔ جسے میں سمجھ سکوں، میرا راستہ اکثر مشکل اور تاریک رہا ہے۔"(۲۴)

"دشتِ سُوس" کے حسین کے جس قدر مخالفین تھے اس قدر ان لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی جو اس کے نظریات سے متفق تھے اور اس کے روحانی مقام سے بھی واقف تھے۔ حسین کے بارے میں دشتِ سُوس میں ایسے کئی مقامات نظر آتے ہیں جہاں اس کے نظریات کی عظمت کی گواہی بھی ملتی ہے۔

۷۔ معاملہ فہمی:

"دشتِ سُوس" کا حسین معاملہ فہمی میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اگر وہ چاہتا تو ناول میں کئی مواقع پر انتشار پیدا کر سکتا تھا لیکن اس کا نظریہ امن و آتشی ہے۔ وہ تخریب کی بجائے تعمیر کا قائل ہے وہ دوستوں کے ساتھ ساتھ دشمنوں کو بھی گلے لگاتا ہے۔ بڑی فراخ دلی سے اپنے مخالفین کو معاف کر دیتا ہے۔ وہ عشق حقیقی کے ساتھ ساتھ عشق مجازی میں بھی جان سے گزر جانا تو پسند کر لیتا ہے لیکن محبوب کو رسوا کرنا اس کے شایان شان نہیں۔ اغول سے اس کا عشق انتہائی بلند سطح پر تھا لیکن جب منصور اس سے اس بابت پوچھتا ہے تو وہ باپ کے سامنے بھی اس کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھتا:

"منصور نے ایک عاشق زار باپ کی طرح حسین کا دل ڈوبتا محسوس کیا۔ اس کی زمانہ شناس نگاہوں نے اس مرض کو بھی شناخت کر لیا۔ اپنے بچے کے چہرے پر بکھری زردی اور ناامیدی نے اس کی اپنی غم آشنا روح کو نہایت مضطرب کیا... جسے حسین نے ہر فانی نگاہ سے چھپا کر بالکل محفوظ رکھا تھا۔"(۲۵)

ہرمن ہیسے اور جمیلہ ہاشمی نے اپنے مرکزی کرداروں میں معاملہ فہمی کی صلاحتیں بھی رکھی ہیں۔ حسین اور سدھارتھ کے نظریات میں معاملہ فہمی بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ دونوں کردار نہ صرف اپنی سوچ وفکر کسی پر تھوپتے نہیں ہیں بلکہ دوسروں کی رائے کا بھی احترام کرتے ہیں۔ سدھارتھ اپنے بیٹے کی محبت میں سرتاپا ڈوبا ہوا تھا لیکن جب واسودیو اسے سمجھاتا ہے کہ تم نے باپ کو چھوڑ کر اپنا راستہ خود بنایا تھا تم اس سے زبردستی کرکے اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتے ہو لہٰذا اسے اکیلا چھوڑ کر آزاد کر دو تو وہ اس حقیقت کو پالیتا ہے اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیتے ہوئے بیٹے کی جدائی کو قبول کر لیتا ہے:

"... اس نے پھر غور کیا تو احساس ہوا کہ وہ بیٹے کے لیے پریشان نہیں تھا اور اس کا من جانتا تھا کہ نہ تو وہ مصیبت میں پھنسا ہے اور نہ ہی اسے لوٹایا جاسکتا ہے پھر بھی وہ لگاتار آگے بڑھتا گیا۔ اسے بچانے کی فکر میں نہیں بلکہ اسے ایک بار آخری بار ہی سہی دیکھ پانے کی خواہش میں وہ شہر کی حد تک جا پہنچا۔"(۲۶)

حسین حامد بن عباس کے مظالم کا جواب صبر سے دیتا ہے۔ وہ چاہتا تو دربار کا اثر استعمال کرکے نہ صرف اپنا دفاع کر سکتا تھا بلکہ حامد بن عباس کے لیے مشکلات بھی پیدا کر سکتا تھا۔ حسین نے جیل سے فرار کرانے کے تمام منصوبوں کو رد کر کے حالات و واقعات کو قابو میں رکھا۔ اس نے اپنے معتقدین کو بغاوت پر نہیں اکسایا۔ اس نے اپنے علم اور عمل سے ہر سوالی کو فیض پہنچایا۔ حسین نے ہمیشہ اپنے والد منصور کے ہر حکم پر لبیک کہا۔ اپنے اساتذہ کی ہمیشہ دل آزاری کرنے سے گریز کیا۔ اپنے خلاف فتویٰ دینے والوں کو بھی دوست قرار دیا اور سزا پر عمل درآمد کرنے والوں کو معاف کر دیا بلکہ سزا پر خوشی کا اظہار کیا کہ اب اس کے اور حق کے درمیان کی آخری دیوار بھی گرنے والی تھی۔ موت کے دروازے پر دشتِ سُوس کا حسین معاملہ فہم شخصیت کے طور پر سامنے آیا۔ اس کے مخالفین کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ اسے سزا سنا کر اس پر ظلم عظیم کیا گیا ہے۔ ناول میں قاضی ابو عمر اس کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"میں اس سے ملا ہوں۔ مجھے تو حُب جاہ اور حُب دنیا دونوں میں سے ایک خواہش بھی اس میں نظر نہیں آئی۔ وہ تو موت کا طلب گار اور اس سے محبت کرنے والا ہے۔ وہ تو آزاد آدمی ہے۔ آزاد آپ سمجھتے ہیں نا۔ پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر قاضی ابو عمر نے کہا۔ اس کا ایک قدم عقبیٰ پر ہے اور ایک دنیا پر، حامد اسے کسی بات کی پرواہ نہیں اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ تم اس کی موت کو قریب لا کر اس کی آرزو پوری کروگے اور اس کا خون ناحق تمہاری گردن پر ہوگا۔ وہ چپ ہو گئے۔"(۲۷)

حسین نے کسی کو بغاوت پر نہیں اکسایا بلکہ ہمیشہ معاملہ فہمی سے کام لیا لیکن زبانِ خلق کو نقارہ خدا سمجھا جاتا ہے۔ ہر زبان اس کے بے قصور ہونے کی گواہی دے رہی تھی اور اس پر ظلم کرنے والوں کو دار پر کھینچنے کی آوازیں اٹھ رہی تھیں:

"کون ہے اس قتل بے گناہ کا اصل محرک کون ہے، لوگوں نے ایک دوسرے سے پوچھا لوگ گھروں سے نکل کر پل کی طرف بھاگ رہے تھے۔ دجلہ کے دونوں کنارے ہجوم خلق سے بے تاب لگتے تھے۔ بوڑھے سر ہلا کر کہتے تھے اس خون ناحق کی وجہ سے اب بغداد پر آفت آئے گی۔ ہراساں عورتیں بے پردہ اپنے بچوں کو سینے سے چمٹائے نکل آئیں، کیا قیامت قائم ہو گئی تھی۔ اس خون ناحق کے ذمہ دار کو دار پر کھینچو۔"(۲۸)

۸۔ عشق مجازی کے حوالے سے:

اغول بصرہ جانے والے قافلے کی نسطوری عیسائی سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والی ایک کنیز تھی۔ اگرچہ حسین اور اس کا ساتھ عارضی نوعیت کا تھا لیکن یہی وہ لمحہ تھا جسے مجاز اور حقیقت کی بجا طور پر کشمکش قرار دیا جا سکتا ہے:

"تم انسانوں میں ذرا دلچسپی نہیں لیتے؟ اس نے ہنس کر پوچھا۔ جب وہ ہنسی تو اس کے دانتوں کی سفیدی چاندنی میں بڑی

دلآویز تھی۔ وہ چپ رہا تو اس نے کہا۔ سب سے اعلیٰ مخلوق انسان ہے اور اگر خدا توفیق دے تو اس کو ضرور غور سے دیکھو۔ ہو سکتا ہے خدا کا جلوہ کسی طور کسی چہرے میں کسی سراپے میں تمہیں دکھائی دے۔ حسین نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بال زردی مائل سنہرے تھے۔ جیسے چاندنی ان میں گندھی ہوئی ہو۔ چہرہ اور آنکھیں بخدا اس نے ایسا حسن پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔"(۲۹)

بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

"یہ تعلق پہلے تعلق خاطر بنا اور پھر تعلق روح۔ یوں کہ ایک دوسرے سے ملے بغیر بھی واقف حال رہے۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ مجاز حقیقت کی سیڑھی ہے تو حسین ایک ہی جست میں مجاز کے مراحل طے کر گیا۔"(۳۰)

"دشتِ سُوس" کا حسین اغول سے ملاقات کے بعد عشق حقیقی کی اس منزل تک پہنچ گیا کہ جس کا تصور بھی محال ہے۔ مجاز سے حقیقت کے اس انوکھے سفر میں حسین دنیائے تصوف کے لیے ایک راہنما تصور کیا جانے لگا:

"حسین کیا تم اتنے دیوانے ہو کہ تمہیں جان سے گزرنے کا بھی خیال نہیں رازی نے کہا کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ یہ جان ہی تو تھی کہ راہ میں حائل تھی۔ اب میں آزاد ہوں۔ میں اور وہ یوں مل گئے ہیں جیسے شراب پانی میں مل جاتی ہے۔ حسین حسین فاطمہ نیشاپوری نے اپنے جگر کو تھام کر کہا۔ یہ کیا ہے یہ تصوف ہے۔ راضی برضا۔ خوش۔ مستعد۔ اس کو پانے کی خوشی میں دیوانہ۔"(۳۱)

"سدھارتھ" کا ہیرو سدھارتھ بھی کملا کی محبت میں اپنی زندگی کے بیشتر ایام تج دیتا ہے اسے صنف مخالف میں ایک انجانی کشش محسوس ہوتی ہے۔ وہ مجازی عشق کے خوشگوار تجربے سے گزر کر زندگی میں رنگ اور سرور لے آتا ہے:

"سدھارتھ نے کہا: پیاری کملا! جب میں باغ میں تمہارے پاس آیا تھا تو وہ میری پہلی کوشش تھی۔ میں شہر کی حسین ترین عورت سے محبت کی تعلیم پانا چاہتا تھا۔"(۳۲)

کملا بھی سدھارتھ سے محبت کا دم بھرتی ہے اور اس کی محبت میں گرفتار ہونے کا اقرار کرتی ہے۔

"سدھارتھ تم بڑے خوش نصیب نکلے تمہارے لیے دروازے کھلتے جا رہے ہیں۔ یہ کیسے ہو رہا ہے؟ تم کوئی ساحر تو نہیں ہو۔"(۳۳)

ہرمن ہیسے کے "سدھارتھ" اور جمیلہ ہاشمی کے "دشتِ سُوس" کے کرداروں میں جذبہ عشق اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ دونوں ہیرو جہاں حقیقی عشق کے اعلیٰ تجربے سے گزرتے ہیں وہاں عشق مجازی سے بھی اپنی زندگیوں کو معطر کرتے ہیں یوں دونوں مجاز سے حقیقت تک کا سفر جذبہ محبت سے ہمکنار ہو کر کرتے ہیں۔ ایک کا راستہ اغول سے اور دوسرے کا کملا سے ہے۔ سدھارتھ عشق مجازی سے عشقِ حقیقی کو پا لیتا ہے۔ جس کا اقرار گووندایوں کرتا ہے:

"... میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے سکون حاصل کر لیا ہے۔ میں یہ
بھی محسوس کرتا ہوں کہ میں اسے نہیں حاصل کر سکا۔ مجھے
ایک بات اور بتاؤ میرے محترم دوست ایسی کوئی بات بتاؤ
جس پر غور و فکر کر سکوں۔ جسے میں سمجھ سکوں، میرا راستہ اکثر مشکل
اور تاریک رہا ہے۔"(۳۴)

حواشی

۱۔ اسلوب احمد انصاری: اردو کے پندرہ ناول؛ لاہور؛ مکتبہ قاسم العلوم؛ س۔ن؛ ص ۳۵۹

۲۔ جمیلہ ہاشمی: دشتِ سُوس: حسین بن منصور حلاج۔ ایک غنائیہ: لاہور؛ سنگ میل پبلی کیشنز؛ ۲۰۱۰ئ؛ ص ۱۹۴

۳۔ ہرمن ہیسے: سدھارتھ(مترجم: یعقوب یاور کوٹی)؛ لاہور؛نگارشات پبلشرز؛ص ۲۴

۴۔ جمیلہ ہاشمی: دشتِ سُوس: حسین بن منصور حلاج۔ ایک غنائیہ: ص ۱۷۱۔۱۷۲

۵۔ ایضاً: ص ۳۶۹

۶۔ ایضاً: ص ۳۹۳

۷۔ ایضاً: ص ۳۷۸

۸۔ ایضاً: ص ۳۲۵

۹۔ ہرمن ہیسے: سدھارتھ (مترجم: یعقوب یاور کوٹی)؛ص ۶۱

۱۰۔ جمیلہ ہاشمی: دشتِ سُوس: حسین بن منصور حلاج۔ ایک غنائیہ؛ص ۴۴۹

۱۱۔ ایضاً: ص ۱۷۵

۱۲۔ ایضاً: ص ۱۷۶

۱۳۔ ہرمن ہیسے: سدھارتھ (مترجم: یعقوب یاور کوٹی)؛ص ۱۳

۱۴۔ جمیلہ ہاشمی: دشتِ سُوس: حسین بن منصور حلاج۔ ایک غنائیہ؛ص ۳۳۱

۱۵۔ ایضاً: ص ۴۷۷

۱۶۔ ایضاً: ص ۴۷۵

۱۷۔ ایضاً: ص ۹۵

۱۸۔ ایضاً: ص ۱۵۱

۱۹۔ ایضاً: ص ۱۸۰

۲۰۔ ایضاً: ص ۴۹۵

۲۱۔ ہرمن ہیسے: سدھارتھ (مترجم: یعقوب یاور کوٹی)؛ص ۹۲

۲۲۔ جمیلہ ہاشمی: دشتِ سُوس: حسین بن منصور حلاج۔ ایک غنائیہص ۳۸۱

۲۳۔ ایضاً: ص ۵۰۲

۲۴۔ ہرمن ہیسے: سدھارتھ (مترجم: یعقوب یاور کوٹی)؛ص ۱۴۲

۲۵۔ ایضاً: ص ۸۶

۲۶۔ ایضاً: ص ۱۲۲

۲۷۔ ایضاً؛ ص ۴۸۶

۲۸۔ ایضاً: ص ۵۰۱

۲۹۔ ایضاً: ص ۷۸

۳۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: داستان اور ناول:تنقیدی مطالعہ(مشمولہ: جمیلہ ہاشمی۔ رومان سے تصوف تک)؛لاہور؛سنگ میل پبلی کیشنز؛ص ۱۶۹

۳۱۔ جمیلہ ہاشمی:دشتِ سُوس:حسین بن منصور حلاج۔ ایک غنائیہ؛ص ۴۹۸۔۴۹۹

۳۲۔ ہرمن ہیسے: سدھارتھ (مترجم: یعقوب یاور کوٹی)؛ص ۶۴

۳۳۔ ایضاً: ص ۶۴

۳۴۔ ایضاً؛ ۱۴۲

☆☆☆☆☆☆☆